© rasailojaraid.com

ایس ایس بخاری

افسانہ

نیا آسماں

آنے والا ہر لمحہ پہلے لمحے کو شکست دیتا ہوا کسی فاتح کی طرح آگے بڑھ رہا ہے اور یوں رات رفتہ رفتہ بیت رہی ہے کہ اسے تو بہر حال بیتنا ہے۔ اور میں شب کے اس سناٹے میں اپنی چارپائی پر لیٹا آسمان کی بے کراں وسعتوں پر جھلملاتے ستاروں کو یونہی تکے جا رہا ہوں۔ یونہی۔ بغیر سوچے سمجھے۔ بلاارادہ۔ کیا میں بھی اس منظر، اس ماحول کا حصہ ہوں؟ یا نہیں ہوں؟ میں انجان بن کر سوچتا ہوں۔ یہ سوچنا مجھے عجیب لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے آپکو کھوج رہا ہوں۔ اور یوں لگتا ہے جیسے اطمینان کی ایک لہر ہے جو وقفے وقفے سے میرے وجود میں دوڑ رہی ہے۔ یہ کیا؟ میں سوچتا ہوں۔ نہیں سوچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور مجھے آج دن کا واقعہ یاد آتا ہے اور پھر آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے کی ایسی ہی ایک رات۔ جس رات کا ہر لمحہ میری بے چینی و بے قراری میں اضافہ کرتا چلا گیا تھا۔ میں جو اپنے معمولات کا پکا آدمی، صبح سویرے اٹھنا اور جلد سونا میرا زندگی بھر کا معمول ہی نہیں اصول بھی ہے۔ اس رات یہ اصول ٹوٹ گیا۔ اس روز جب شام کے جھٹپٹے میں باہر کے کام سے فارغ ہو کر میں گھر پہنچا تو دیکھا زبیدہ صحن میں جھاڑو دے رہی ہے اور چہرے پر کچھ خفگی کے آثار بھی تھے۔ میں صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا اتنے میں وہ بھی فارغ ہو کر ہاتھ منہ دھو کر میرے پاس آگئی۔ میں نے اسکی خفگی کا راز جانتے ہوئے بھی جب اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "لگتا ہے آج میری بیٹی نے بہت کام کیا ہے" تو وہ خاموش رہی پھر ایک دم بولی "ابا! آج آپ کو میری بات ماننا پڑے گی" اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس نے پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔ دھیما دھیما اصرار آج شدت اختیار کر گیا تھا۔ اتنے میں اذان ہوئی اور میں نماز ادا کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسجد سے فارغ ہو کر ڈیرے پر چلا گیا۔ اور جب گھر واپس آیا تو زبیدہ اور اسکی ماں سو رہی تھیں۔ زبیدہ کو دیکھتے ہی مجھے اسکی بات پھر یاد آگئی۔ میں خاموشی سے دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ سونے کی کوشش کی لیکن نیند ساتھ چھوڑ گئی۔ زبیدہ کی بات ذہن میں ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ "ابا! آج آپ کو میری بات ماننا پڑے گی"۔

میرے چاروں بچوں میں زبیدہ سب سے چھوٹی ہے اور یوں مجھے پیاری بھی بہت۔ بڑے تینوں بچے دو بیٹے اور بیٹی شادی شدہ ہیں اور اتفاق سے تینوں ہی شہر جا بسے۔ گو کہ گاہے بگاہے ملنے آتے رہتے ہیں لیکن اب گھر بھر کی رونق زبیدہ سے ہی قائم ہے۔ اس نے گاؤں کے سکول سے اسی سال دسویں کا امتحان پاس کیا تو اس بات کا اظہار کیا کہ وہ اپنی سہیلی ساجدہ کے ساتھ کالج داخلہ لے گی۔ "کون ساجدہ وہی چوہدری اکرم کی بیٹی؟" جی! بیٹا وہ اگر داخلہ لیتی ہے تو ان کی مرضی لیکن تمہارا اتنی دور اکیلے جانا مناسب نہیں میں نے پیار سے سمجھایا تو وہ مان گئی اور اپنی ماں کے ساتھ گھر گرہستی کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ ساجدہ کے ساتھ اسکی دوستی اب بھی تھی کبھی وہ آجاتی اور کبھی یہ ملنے چلی جاتی۔ میں کچھ عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ زبیدہ کی گفتگو میں کچھ تبدیلی سی آئی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسی بات کہتی کہ میں چونک جاتا۔ جیسے ایک دن وہ کہہ رہی تھی ابا! یہ گاؤں کے لوگ اتنے دقیانوسی کیوں ہیں؟ دنیا کہاں سے کہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچ گئی اور یہ ابھی تک پرانے طور طریقوں، ریتوں رسموں کو ہی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ نہیں بھئی یہ بات نہیں دنیا بے شک جہاں مرضی پہنچ جائے اور سائنس جتنی بھی ترقی کر لے روایات سے کٹ تو نہیں سکتی۔ پھر اچھی روایات اچھے چلن اور اچھے اخلاق کی حیثیت تو مسلمہ ہے۔ ان کے بغیر زندگی بے معنی اور پھیکی ہے بالکل بے ہنگم۔ پرانا ہونا کوئی عیب ہے؟ کوئی برائی ہے کیا؟ اور بیٹا یہ دقیانوسی کا پروپیگنڈہ تو نئی تہذیب کے ان متوالوں کا ہے جو ہر اچھی بات پر دقیانوسی کا لیبل لگانے کو ترقی سمجھتے ہیں پھر ترقی اور نیچ پن میں فرق کیا ہوا؟ میری اس گفتگو سے وہ خاموش تو ہو گئی لیکن شاید مطمئن نہیں۔ ایک دن وہ بولی "ابا! آپ سے ایک بات کہنی ہے" "کہو" یہ جو درخت ہے نا اسے کٹوا دیجئے۔ بھی وہ کیوں؟ میں حیرت زدہ سا بولا۔ ایک تو سارا دن اس پر پرندوں کا شور رہتا ہے اور دوسرے پتے گرتے ہیں تو صحن میں گند پھیلتا ہے بار بار صفائی کرنا پڑتی ہے۔ نہیں بیٹا یہ درخت تمہارے دادا جان نے لگایا تھا۔ پتے گرتے ہیں تو پھر کیا ہوا اسکی چھاؤں بھی تو ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی۔ لیکن زبیدہ کے نزدیک اب جبکہ بجلی آچکی تھی اسکی چھاؤں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بجلی کے پنکھوں اور ایر کولر کا مقابلہ یہ درخت کر سکتا ہے؟ وہ وقتی طور پر خاموش تو ہو گئی لیکن دھیما دھیما اصرار جاری رہا اور میں ٹالتا رہا۔ یہ بات درست تھی کہ اب ہماری دوپہریں پنکھے اور ایر کولر میں گزرتیں۔ لیکن بہرحال اسکی اپنی ایک اہمیت تھی اور میں اسے کٹوانے پر کسی صورت آمادہ نہ تھا۔ لیکن زبیدہ کے لہجے میں آج جو قطعیت تھی لگتا تھا کہ اب وہ اس کے وجود کے بالکل برداشت نہیں کرے گی۔ اور میں اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں میرے لئے کسی ایک راستے کا انتخاب مشکل ہو رہا تھا۔ یہ درخت میرے بابا کی نشانی تھا۔ اس کے نیچے دو نسلیں پروان چڑھی تھیں۔ میں، میرے بچے اور اب تیسری نسل میں چاہتا تھا وہ بھی اسکی چھاؤں میں کھیلے اسکے سائے میں بیٹھے کہ یہ اس کے بڑوں کی نشانی تھا۔ اس سے بہت سی یادیں اور باتیں وابستہ تھیں۔ بہت سے منظر اب بھی میری آنکھوں میں اس کی وجہ سے محفوظ تھے۔ بابا گرمیوں کی دوپہر ہمیشہ اسی کے سائے میں گزارتے تھے۔ گھر میں کوئی تقریب ہوتی یا کوئی صلاح مشورہ کرنا ہوتا تو خاندان کے بڑے یہیں اکٹھے ہوتے۔ چارپائیاں بچھ جاتیں جن پر چاندنی کھیس اور گاؤ تکیے رکھ دیئے جاتے پھر حقوں کی گڑگڑاہٹ میں خوب محفل جمتی۔ کتنے ہی راز تھے جو اس کے سینے میں دفن تھے۔ میں اور میرے بچے اسی پر جھولا جھولتے عمر کی اس حد کو پہنچے تھے اور اب جب شہر سے میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں آتے تو انکی پہلی فرمائش یہی ہوتی کہ انہیں جھولا ڈال دیا جائے۔ اور پھر ان کے قہقہوں اور کلکاریوں سے گھر میں نغمے سے بکھر جاتے۔ ان کے ماں باپ لاکھ ڈانٹ کے انہیں کمروں میں سلائیں لیکن ان کا اصرار ہوتا کہ وہ دوپہر اسی کے نیچے گزاریں گے۔ مجھے تو یوں لگتا جیسے اس گھر کی ہر خوشی اسی سے وابستہ ہو۔ اور اب میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ زبیدہ کی بات مانوں یا ------؟ ایک طرف ماضی تھا اور دوسری طرف حال۔ ایک طرف بوڑھی اور تجربہ کار سوچ تھی تو دوسری طرف نئی اور جوان امنگیں۔ ایک طرف روایات و اقدار کی پاسداری تھی تو دوسری طرف نئی سوچ اور نئے تقاضے تھے۔ جدت تھی۔ خواہشیں تھیں، ولولے تھے، جذبات تھے، تغیر تھا، تبدیلی ہی تبدیلی تھی۔ اور میں ایک دوراہے پر کھڑا سوچ رہا تھا ماضی اور حال کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے کیوں؟ شاید ------ نہیں نہیں یہ فاصلہ حد سے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ میں اس فاصلے کو مزید نہیں بڑھنے دوں گا ------ لیکن کیسے؟ میرے دل و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دماغ میں جنگ جاری تھی دل کچھ کہتا تھا تو دماغ کچھ سوچتا۔ پھر ------ پھر بالآخر میں نے دماغ کی بات مانتے ہوئے ایک فیصلہ کر لیا۔ اور یہ فیصلہ کرتے ہوئے نہ جانے کیوں میری آنکھوں کے گوشے خود بخود بھیگ گئے ------ بابا! مجھے معاف کر دینا میں آپ کی نشانی کی حفاظت نہ کر سکا۔ شاید وقت کی آواز کو پہچاننا اور قربانی دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اور جب سگریٹ کا ٹکڑا میرے ہاتھوں کو جلانے لگا تو میں ایک دم ہوش میں آیا یوں جیسے ایک طویل تھکا دینے والا سفر کیا ہو۔ باہر آ کر دیکھا تو صبح کا اجالا دھیرے دھیرے ہر چیز پر پھیل رہا تھا۔ میں اپنے فیصلے پر مطمئن تھا بہت مطمئن ---۔ پھر صبح میں نے گھر سے باہر نکلتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ آج مزارع کا بیٹا "کالو" آ کر درخت کاٹ جائے گا۔ میں نے کالو کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور خود کام کے سلسلے میں شہر چلا گیا۔ شام گئے جب گھر لوٹا تو اتفاق سے زبیدہ ہی سامنے کھڑی تھی۔ آج اسکے چہرے پر خفگی کے آثار دور دور تک بھی نہ تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھی۔ "ابا دیکھا آج گھر کتنا روشن روشن لگ رہا ہے" صحن بھی صاف ستھرا ہے اور پرندوں کا بھی شور نہیں ورنہ تو اس وقت اک ہنگامہ ہوتا تھا۔ شام جب بسیرا کرنے کیلئے اکٹھے ہوتے تو کان ہی کھا لیتے تھے۔ میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ ہاں ابا کالو نے درخت کو تنے سے نہیں کاٹا یہ چھوڑ گیا ہے کہہ رہا تھا ملک صاحب نے ایسے ہی کہا تھا۔ میں نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا بیٹا یہ بیچارہ ٹنڈ منڈ سا تنا تو اب کوئی تکلیف نہیں دے گا نہ ہی صحن میں گند پھیلائے گا اور نہ اس پر پرندے ڈیرا جمائیں گے۔ میری اس بات پر زبیدہ خاموش ہو گئی یوں جیسے اسے واقعی اس تنے سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ میری کیفیت عجیب تھی۔ گھر میں ویرانی اور اداسی محسوس ہوتی تھی۔ نہ اب صبح نور کے تڑکے چڑیوں کی چہکار ہوتی اور نہ شام کو بسیرے کے لئے پرندوں کا شور۔ اب میں نے کسی گلہری کو اس پر بھاگتے نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بلبل اور کوئل اس گھر کا رستہ بھول گئی ہوں۔ وقت گزرتے پتہ نہیں چلا اور اس بات کو تقریباً چھ ماہ گزر گئے۔ اور آج کے ایک واقعے نے میرے اندر اک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے مجھے اس واقعے کا انتظار تھا۔ میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ زبیدہ اس کٹے ہوئے تنے کو اکثر و بیشتر دیکھتی رہتی ہے۔ مگر میں اسے اپنا وہم یا خیال کہتا۔ لیکن کل جب زبیدہ نے کہا "ابا! یہ کون سا موسم ہے برسات ہے نا؟" ہاں بیٹے۔ ابا کہتے ہیں کہ اس موسم میں ٹنڈ منڈ سوکھے تنے بھی ہرے ہو جاتے ہیں۔ میں ایک دم چونک گیا بیٹا تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟ کچھ نہیں بس ایسے ہی۔ مجھے لگا جیسے وہ کچھ چھپا گئی ہے۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ لیکن ایک خدشہ میرے دل میں گھر کر گیا۔ اور آج ------ آج تو حد ہو گئی سہ پہر کے قریب جب میں سو کر کمرے سے باہر آیا تو ششدر رہ گیا ------ زبیدہ پانی کا پائپ پکڑے شیشم کے اس ٹنڈ منڈ تنے کو پانی دے رہی تھی مجھ پر نظر پڑتے ہی بولی "ابا! یہ تنا پھوٹ پڑے گا نا؟" "اس کی کونپلیں نکل آئیں گی؟" ہاں بیٹا ہاں۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ پتہ نہیں کیوں میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔ اور اب رات کے اس گھمبیر سکوت میں میں اس واقعے پر سوچ رہا ہوں۔ آسودگی اور شانتی کی ایک لہر ہے جو میرے وجود میں سرایت کر جاتی ہے۔ میرے کانوں میں زبیدہ کا جملہ گونج رہا ہے۔ ابا! یہ تنا پھوٹ پڑے گا نا؟ اسکی کونپلیں نکل آئیں گی؟ ہاں بیٹا۔ ضرور۔ اسکی کونپلیں نکلیں گی یہ پھر سے ہرا ہو گا۔ اسکی شاخیں اور پتے پھیل جائیں گے۔ آئندہ آنے والے نسلیں اسکی چھاؤں میں پروان چڑھیں گی۔ اس پر پھر سے پرندے گیت گائیں گے، قہقہے گونجیں گے، ننھے بکھریں گے، پرندے چہچہائیں گے۔ اب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی آبیاری کا بوجھ بوڑھے اور جھکے ہوئے کندھوں پر نہیں بلکہ جوان اور طاقت ور شانوں پر ہوگا۔ اب۔۔۔۔اب کبھی کوئی زبیدہ اسکو کاٹنے کی خواہش نہیں کرے گی۔ اب ماضی اور حال کے فاصلے کبھی حد سے نہیں بڑھیں گے۔ میرا انگ انگ خوشی سے معمور ہے اور تاروں بھرا آسمان میری خوشیوں میں شریک۔ میں نے ایسا آسمان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔

نعت

لالہ صحرائی

سجا ہے سامنے روئے محمد
مری نعتیں ہیں خوشبوئے محمد

قیامت کی فضائیں ضوفشاں ہیں
ہے میرے روبرو روئے محمد

رواں ہے سوئے جاں اک سیلِ نکہت
ہُوا ہے جاں کا رخ سوئے محمد

کوئی تو خواب ہو، خوابِ مبارک
میں دیکھوں خواب میں روئے محمد

جو بوئے خُلد آتی ہے حرم سے
یہی ہے اصل میں بوئے محمد

نگہ کا، جذبِ دل کا، اور جاں کا
چلا ہے کارواں سوئے محمد

ملائک اور بشر، سب اس کے خواہاں
کہ پیارا ہے بہت کوئے محمد

© rasailojaraid.com